خورشید علی

پی ایچ ڈی اسکالر

شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

ڈاکٹر فرزانہ کوکب

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

رتن ناتھ سرشار اور سجاد حسین کے ہاں اردو مزاحیہ کرداروں میں لکھنوی تہذیب و ثقافت کی پیشکش: تقابلی مطالعہ

ABSTRACT

Presentation of Lucknowi Era in the humorous charaters of Ratan Nath Sarshar and Sajjad Hussain: Comparative study

By Muhammad Khursheed Ali, PhD Scholar, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan.

Dr. Farzana Kokab, Assistant Professor, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan

Ratan Nath Sarshar (1846-1902) was a novelist and journalist. In his novels he created some humorous characters to present culture of Lucknow especially his humorous character "Khoji" is very popular. Sajad Hussain (1856-1915) was also a journalist and a novelist. He started first humorous newspaper "Awadh punch" in 1877 from Lucknow. In his novels he also presented culture of Lucknow. For this purpose he created humorous characters. "Haji Baghlol" is a well known and popular humorous character. This article will provide a comparative study in the writings of Ratan Nath and Sajjad Hussain. Especially, a critical analysis will be carried out to represent the Lakhnawi Culture by showcasing the talents of these humorous characters.

کسی بھی معاشرے میں حقیقی معذور وہ ہوتے ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں مگر حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے، کان رکھتے ہیں مگر سچ سننا پسند نہیں کرتے، دماغ رکھتے ہیں لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں زبان رکھتے ہیں مگر حق بات کہنے سے ڈرتے ہیں کیوں کہ حق بات کہنا آسان نہیں ہوتا۔ معاشرے میں موجود میول، کج رویوں، معاشرتی حقائق اور لوگوں

کے طرز زیست کو بیان کرنے میں بہتوں نے جان سے ہاتھ دھوئے ہیں۔ جعفر زٹلی نے جب بادشاہ فرخ سیر کے خلاف بے باکی سے شعر کہا تو بادشاہ، ناراض ہوا اور اس نے جعفر کو قتل کروا دیا۔ برسر اقتدار قوتیں ادیبوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کرتی ہیں تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

دورِ باطل میں حق پرستوں کی
بات رہتی ہے، سر نہیں رہتے

ادیب فن کار ایسے حالات میں اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے اور معاشرتی برائیوں کے سدباب کے لیے ایسے حل کو تلاش کرتے ہیں کہ ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' یعنی وہ اپنی بات بیان کردیں اور سننے والے کو گراں نہ گزرے لہٰذا وہ مزاح کے ذریعے معاشرتی برائیوں اور لوگوں کے رویوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں گویا زہر کی گولیوں کو شکر میں لپیٹ کر دیتے ہیں کیوں کہ ادیب ایک واعظ، مصلح اور مبلغ کی صلاحیتیں رکھتا ہے وہ معاشرے کے حقائق اور سماج کے خدوخال کو دیانتداری اور جرأت مندی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

معاشرتی رسوم ورواج، اقدار ومعیارات، اعتقادات اور تہذیب وثقافت کی مختلف طریقوں سے عکاسی کرنا ادیب کا ہنر ہوتا ہے اس کے فن پاروں میں معاشرے کی روایات، ملبوسات، آداب نشست وبرخاست اور معاشرے کے افراد کے طرز زیست کے مکمل نمونے موجود ہوتے ہیں وہ معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ بھی اٹھاتا ہے اور معاشرتی حقائق بھی بیان کرتا ہے۔ ادب کو معاشرے کا وسیلہ اظہار قرار دیا جاتا ہے اور ادیب اپنے معاشرے کا مبصر اور نقاد ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی تخلیقات میں معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ ادیب معاشرے کے ہر پہلو کی نمائندگی نہیں کرسکتا وہ معاشرے کے فقط انھیں طبقات یا پہلوؤں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے جو اس کے دائرہ عمل یا احاطہ مشاہدات وتجربات میں آتے ہیں لیکن وہ اپنے عہد اور معاشرہ کا ترجمان ہوتا ہے اور فن پاروں میں اپنے عہد کے لوگوں کے ذہنی، سیاسی، مذہبی رویوں کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کو بھی سمودیتا ہے۔ یوں ادیب کی زندگی تہذیب کی آئینہ دار اور عکاس ہے۔ ادیب جب معاشرے کی طرز زیست کو بیان کرتا ہے تو اس میں مزاح کی مختلف صورتوں ظرافت، بذلہ سنجی، ضلع جگت، تحریف، رعایت لفظی، رمز، ہجو وہزل، پھکڑ پن، پھبتی، شوخی، نوک جھونک، مذاق لطیفہ، لفظی ہیر پھیر، مبالغہ، کایا کلپ، مزاحیہ صورت حال کے علاوہ مزاحیہ کردار سے بھی کام لیتا ہے۔ مزاحیہ کردار سے مراد ایسا کردار ہے جو ماحول کی سنجیدگی کو توڑ دے اور ہنسی ابھارنے کا باعث بنے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

''مزاحیہ کردار جس کی بدولت تمام ماحول مضحکہ خیز صورت اختیار کرجاتا ہے۔''(۱)

بلاشبہ کوئی بھی مزاحیہ کردار نہ صرف ماحول کو مضحکہ خیز بناتا ہے، بوریت، ذہنی الجھنوں، پریشانیوں کو وقتی طور پر دور کرتا ہے بلکہ ان حدوں کو پار کرکے وہ معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی بنتا ہے یعنی ادیب مزاحیہ کردار صرف ماحول کو

خوشگوار بنانے کے لیے ہی تخلیق نہیں کرتا وہ معاشرہ میں موجود کج رویوں اور برائیوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے بھی ان کو تخلیق کرتا ہے ادیب مزاحیہ کرداروں کی بے وقوفانہ حرکات، مسخرانہ حلیے، ابنارمل رویے اور فلسفیانہ گفتگو سے معاشرتی رویوں کو طنز کا نشانہ بنا کر ایک عہد اور اس کی تہذیب وثقافت کو زندہ جاوید بنا دیتا ہے۔ کردار کی تخلیق میں شخصیت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے اور کردار کو ماحول کے مطابق ڈھال دینا ادیب کی اضافی خوبی ہے۔ اس ضمن میں وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

> کردار افسانہ نگار کے ہاتھ میں کٹھ پتلی معلوم ہوتا ہے جب تک فنی تربیت کی مدد سے اسے ماحول اور واقعات کے مطابق نہ بنایا جائے۔ (۲)

مزاحیہ کردار غیر سماجی مزاج کا حامل ہوتا ہے اس کی حرکات مضحکہ خیز اور حماقتیں ہنسی کو ابھارتی ہیں، خود احمق ہوتا ہے لیکن دوسروں کو احمق سمجھتا ہے، اس میں خود کو نئے ماحول میں adjust کرنے کی خوبی نہیں ہوتی، ڈینگیں مارنا، بے پر کی اڑانا، حماقتوں پر حماقتیں کرنا، بدحواس ہونا، اوٹ پٹانگ حرکات کرنا، عجیب وغریب اور احمقانہ گفتگو کرنا، مزاحیہ کردار کی اضافی خوبیاں ہیں جو قاری کو لبھاتی ہیں لیکن ادیب کا مقصد معاشرہ کو منعکس کرنا ہوتا ہے اور وہ اپنے مقصد پر نظر رکھتا ہے اور ان کرداروں کی بظاہر احمقانہ گفتگو گہرے فلسفیانہ نقطے ہوتے ہیں اور معاشرتی مسائل کی کئی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں آیئے دیکھتے ہیں کہ مزاحیہ کرداروں کے ذریعے پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی اور منشی سجاد حسین لکھنوی نے لکھنؤ کی طرزِ زیست اور تہذیب و ثقافت کو کیسے بیان کیا ہے۔

لکھنؤ پہلے رام چندر جی کے بھائی لچھمن کی وجہ سے لچھمن پور کہلاتا تھا شہنشاہ اکبر کے زمانے میں لکھنؤ بنا، سلطنت مغلیہ کا زوال ہوتے ہی سلطنت اودھ کی بنیاد پڑی اور فیض آباد راجدھانی قرار پایا۔ اورنگزیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد نواب سعادت علی خان نے ۱۷۲۱ء میں اودھ کی بنیاد ڈالی ان کے مرنے کے بعد ان کے داماد اور بھانجے "ابو المنصور صفدر جنگ" ۱۷۳۹ء میں صوبے دار بنے، ۱۷۵۶ء میں ان کے شہزادے "شجاع الدولہ" اور ان کے بعد "آصف الدولہ" تخت پر بیٹھے آصف الدولہ نے فیض آباد کی جگہ لکھنؤ کو راجدھانی بنایا۔

> آصف الدولہ کی تخت نشینی سے اودھ کی تاریخ میں جدید دور کی ابتدا ہوتی ہے انھوں نے فیض آباد کو ترک کر کے لکھنؤ کو اودھ کی راجدھانی بنایا۔ (۳)

۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ کی وفات کے بعد وزیر علی خان چار ماہ کے لیے اور پھر سعادت علی خان تخت پر بیٹھا، غازی الدین حیدر ۱۸۱۹ء میں، اس کا بیٹا نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں ان کے بعد سعادت علی خان کا بیٹا محمد علی اور ۱۸۲۴ء میں محمد علی کا بیٹا "امجد علی شاہ" تخت پر براجمان نظر آتے ہیں۔ ۱۸۴۷ء میں ان کے انتقال کے بعد "واجد علی شاہ" کو بادشاہ بنایا گیا کمپنی نے ۱۸۵۶ء میں اسے معزول کر کے اودھ کو ضبط کر لیا۔ دلی پر بھی بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے حالات تنگ تھے اور لوگ تلاش معاش کے لیے ہجرت کرنے پر مجبور تھے ایسے میں لکھنؤ کے حالات سازگار تھے، پیسے کی ریل پیل کی بدولت بے

فکری کا دور دورہ تھا یوں اودھ کی ضبطی اور دلی کی بربادی بھی لکھنؤ کے بسنے کا سبب بنی یہاں لوگوں میں تعیش پسندی کی بدولت اخلاقی قدریں بری طرح مجروح ہوئیں اور لوگوں کے شب وروز عیش وعشرت میں گزرنے لگے یہاں عیش کے وسائل، نشاط کے ذرائع اور تعیش کے تمام لوازم اضافی صورتوں میں موجود تھے۔

> لکھنؤ کا کلچر... طاؤس و رباب اوّل اور اس سے جنم لینے والے اس احساس پر مبنی تھا... عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! (۴)

لکھنؤ عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا تھا ہر کوئی رنگ رلیاں منانے میں مصروف، نشاط کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ افیون، چانڈو، تاڑی، ٹھرا اور شراب کے نشے عام تھے۔ پتنگ بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی خاص طور پر رنڈی بازی عام تھی۔ شطرنج، گنجفہ، چوسر، تاش جیسے کھیلوں نے کئی گھر اجاڑے۔ ہنسی کھیل، دھول دھپا اور خوش گپیاں ان کے مشاغل بن گئے۔ ایسے میں لکھنؤ کی ثقافت اپنے پیروں پر کیسے کھڑی ہوسکتی تھی معاشرہ خود اعتمادی کھو کر وقتی اور عارضی سہارے تلاش کر کے غم غلط کرنے لگا۔ طوائف، موسیقی، تصنع، تفریح اور دل لگی کے مختلف مشاغل لوگوں نے اپنا لیے۔ ان کی ثقافت میں لذت کو ڈھونڈنا، عیش کرنا اور دل کو بہلانا ہی ہوگیا۔ واجد علی شاہ کے دور کی تہذیب وثقافت کو دو مزاح نگاروں پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۳ء)، اور منشی سجاد حسین لکھنوی (۱۸۵۶ء تا ۱۹۱۵ء) نے مزاحیہ کردار نگاری کے ذریعے پیش کیا۔

رتن ناتھ سرشار صحافی اور مزاح نگار تھے ان کی ادبی زندگی ۱۸۷۰ء کے بعد شروع ہوئی۔ "مراسلہ کشمیر" میں اصلاحی مضامین لکھے اور بعد میں ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کے اجرا کے ساتھ ہی کچھ مضامین ادھر بھیجے اور وہاں مستقل لکھنے لگے۔ ۱۸۷۸ء میں "اودھ اخبار" (جس کے مالک نول کشور تھے) کے ایڈیٹر ہوئے اور اس میں "ظرافت" کے عنوان سے مضامین لکھنے شروع کیے۔ یہ مضامین محرم، چہلم، عیش باغ کے میلوں، وہاں کے ماحول اور طرزِ زیست کے بارے تھے بعد میں ان مضامین کی کڑیوں کو جوڑ کر افسانہ کا سلسلہ نکالا اور "فسانۂ آزاد" ۱۸۸۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا اس داستان نما ناول کا مشہور مزاحیہ کردار "خوجی" لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کا آئینہ دار ہے۔ عبد الطیف اختر سرشار کی کردار نگاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> سرشار نے جو کردار بھی تخلیق کیے ہیں وہ چلتے پھرتے انسان ہیں، بے جان لاشے نہیں جنھیں جس طرف چاہا دھکیل دیا وہ اپنے معاشرے کے صحیح نمائندے ہیں یہ سب کردار نمونے (type یا خاکے caricature) ہیں جن کا مقصد لکھنوی فضا پیدا کرنا اور اسے زندگی بخشنا ہے۔ (۵)

سرشار فطرتاً ہنسوڑ واقع ہوئے تھے ان کو اردو کا "ڈکنس" قرار دیا گیا ہے خوجی کے ذریعے انھوں نے لکھنؤ کے ماحول، انسانی رویوں، معاشرت اور تمدن، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی مذموم

رسومات کا خاکہ اڑایا ہے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کردار کے ذریعے بزدلی، توہم پرستی، جہالت، ضعیف الاعتقادی، سستی، کاہلی، بے کاری، تکلف، تصنع، بناوٹی زندگی اور نمود ونمائش کی مذمت کی گئی ہے۔ عیش وعشرت کے لمحوں کا ذکر کرتے ہوئے سرشار کا قلم نوابوں کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ خوجی کا کردار آوارہ مزاج، اوباش، چانڈو باز، اور افیمی لوگوں کی زندگی کا سچا عکاس ہے۔

> خوجی اس معاشرے کا ایک نمائندہ کردار ہے اس کے لاشعور کی دنیا میں ماضی کی قوت اور عظمت نے اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں۔ (۶)

خوجی گھامڑوں کا گھامڑ، جانگلو، گنوار، کندہ ناتراش، نامعقول، احمق، بدحواس، خبطی، گھونگھے اور پرلے درجے کا گاودی ہے۔ جناب کا نام "خواجہ بدیع الزماں" المعروف خوجی ہے محمد احسن فاروقی کہتے ہیں کہ "یہ فوٹو گراف نہیں بلکہ مضحک خاکہ ہے"۔ خوجی گپ اڑانے کا بادشاہ ہے اس کے جملے زاعفران بکھیرتے ہیں۔ ماحول کو مضحک بنانے میں خوجی کا جواب نہیں وہ حاضر جواب، جگت مارنے والا، چرب زبان قسم کا بونا ہے خوجی میں یہ اوصاف لکھنوی معاشرے کی دین ہیں اس کی عادتیں تہذیب کو پیش کرتی ہیں کیوں کہ سنجیدگی دم توڑ چکی تھی لوگوں کے پاس فرصت کے وافر اوقات تھے اس لیے عیش ونشاط کی محفلیں آباد تھیں اور ایسی محفلوں میں گپ اڑائی جاتی تھی، ہنسا جاتا تھا۔ خوجی کا ڈینگیں مارنا اور شیخی بگھارنا لکھنؤ کی تہذیب کا خاصا تھا یہ دور واجد علی شاہ کا دور تھا جس کا ترجمان اور عکاس خوجی ہے۔ اس دور میں زندگی کا مقصد تفریح تھا، اپنی کمزوری اور برباد ماضی کو چھپانے کے لیے بھی معاشرہ تصنع اور ظاہری چمک دمک کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ خوجی کی شکل میں زوال شدہ لکھنؤ کی تہذیب ہے۔ جمیل جالبی ''فسانۂ آزاد'' اور خوجی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> زوال شدہ لکھنؤ اور مسلم تہذیب کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ خود یہ تہذیب اس ناول میں محفوظ اور اجاگر ہوگئی ہے اس ناول میں ہر طبقے کے مردوں اور عورتوں کے کردار ہیں لیکن ایک کردار خصوصیت کے ساتھ ایسا ہے جو زندہ جاوید ہوگیا ہے عرف عام میں اس کردار کا نام "خوجی" ہے۔ (۷)

بے وقوفوں کے سردار، عقل سے لٹھ، نیم دیوانہ، باتونی، مسخرہ یعنی خوجی کو زبان دانی پر فخر ہے اصل میں اس وقت فارسی زبان کا زور تھا اور فارسی میں لمبے چوڑے القابات اور تعظیم کے لیے باتیں لکھنا عام تھی فارسی میں بات کرنا عظمت کی نشانی تھی اس لیے خوجی غلط فارسی بول کر ایسے لوگوں کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں جو زبان کی آڑ میں جھوٹی عزت کے طالب تھے۔ خوجی ایک نواب کے مصاحب ہیں اور مصاحب بھی ایسے کہ خوشامد کر کے نوابوں سے پیسے بٹورنا چاہتے تھے اصل میں عیش وعشرت کی زندگی گزارنا ہر فرد کی تمنا تھی لہٰذا کچھ تو اس عارضی اور لمحاتی خوشی کے حصول کے لیے دوسروں کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتے، چوری کرتے، ڈاکے ڈالتے یا کسی کی گردن مارتے مگر عیش وعشرت کے لیے پیسے کو حاصل کرتے۔ اور کچھ

خوجی کی طرح خوشامدی بن کر نوابوں سے پیسے بٹورتے۔ خوجی ایک نواب کے مصاحب بن کر جب بٹیر کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں سانڈنی کی تعریف کرتے ہیں تو یہ نواب کو اُلو سے مزید اُلو بنانے کا ایک طریقہ ہے بٹیر کے متعلق خوجی کہتے ہیں کہ:" کیا شان کبریائی۔ خداوند میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلا دی مگر واللہ باللہ ثم باللہ جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو... واہ میاں صف علی شکن شاہ"۔ نواب خوجی کی خوشامد کو نمک حلالی سمجھ کر انعام سے نوازتے ہیں۔ خوجی اپنی عیاشی اور نشاطیہ زندگی کے لیے جھوٹی خوشامدیں کرتا ہے وہ لکھنؤ کے عیش پرست ماحول کا باشندہ ہے وہ مدہوش رہنا چاہتا ہے اور مدہوشی کے لیے وہ افیم استعمال کرتا ہے افیم کے لیے اسے پیسے چاہییں اس مقصد کے لیے وہ نواب کی دم میں رسا باندھتا ہے یعنی اُس کی خوشامد کر کے اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اس دور کے اکثر مصاحبوں کی یہی عادت تھی خوشامد خوروں نے ایک بٹیر کو صف شکن بتا دیا اور صف شکن کو صف شکن علی شاہ، کوئی بٹیر کو نورانی مخلوق کہتا، کوئی کہتا وہ عربی سمجھ لیتا ہے، کوئی کہتا اسے قرآن کے پارے یاد تھے ایک نے کہا میں نے نماز پڑھتے دیکھا، ایک بولا ہنستے ہوئے دیکھا، ایک نے پہلوان بنا دیا کہ ڈنٹر پیلتے دیکھا جتنی خوشامد کوئی کرے گا اتنا انعام اور مراد پائے گا۔ گو کہ نوابوں کو یہ پتا بھی ہوتا تھا کہ ان کی خوشامد ہو رہی ہے مگر اپنی تعریف سننا انسان کی جبلت میں ہے اور نواب تو اس کے زیادہ ہی شوقین تھے خوجی نے خوشامدی انداز اختیار کر کے اس طبقے کی ترجمانی کی ہے جو ہاتھ پاؤں مارنے (محنت کرنا) کی بجائے زبان چلا کر (خوشامد کر کے) سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے سستی، کاہلی ان لوگوں کی عادت بن چکی تھی تصنع، ظاہرداری کے علاوہ وہ لطف چاہتے تھے دل بہلانا چاہتے تھے ایسے میں بے حیا اور بے شرم بن کر خوشامد کرنا عیب نہیں ہنر سمجھا جاتا تھا۔ بٹیر باز نواب بٹیر بازی میں روپے لگاتے تھے اور بٹیروں کو اپنی زندگی کا قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے بٹیر بازی کا یہ دور نواب سعادت علی خان کے عہد سے شروع ہوتا ہے بٹیروں کے نام بھی بڑے شاندار جیسے رستم، سہراب، شہرہ آفاق رکھے جاتے پالیوں میں بڑی بڑی بازیاں بھری جاتی

"نصیر الدین حیدر اپنے سامنے میز پر بٹیروں کی بازی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔"(۸)

جب بادشاہ ایسے کھیل تماشوں کے دلدادہ ہوں تو ان کے وزرا، امراء اور نوابوں کے علاوہ نچلے طبقے میں بٹیر بازی کا پروان چڑھنا اچنبھے کی بات نہیں۔ خوجی کی ایک کمزوری کہ خوجی عورتوں پر ریجھتا ہے وہ "فسانۂ آزاد" میں جگہ جگہ عورتوں پر رال ٹپکاتا نظر آتا ہے اصل میں وہ رال لکھنؤ کے باشندوں کے منہ سے ٹپک رہی ہے کیوں کہ لکھنوی تہذیب میں عورت فلسفہ حیات کی شکل اختیار کر گئی تھی، عورت جنسی لذت کا ذریعہ اور عیاشی کے سامان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ خوجی کا عورتوں کو دیکھ کر اشعار پڑھنا، ان پر عاشق ہونا، نظارہ بازی کرنا عادت ہے۔

عورتوں میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے والے لوگوں کے رویوں کو بیان کیا گیا ہے اور عورت سے ملاپ اور تسکین کی غرض سے ان کی بے عزتی ہو، رسوائی ہو، ذلت کا سامنا کرنا پڑے کوئی معنی نہیں رکھتا خوجی کی بے عزتی اصل میں لکھنؤ کے باشندے کی بے عزتی کی ترجمان ہے۔ میڈا جب خوجی کو چپت لگاتی ہے تو آزاد کو کہتے ہیں کہ بوسہ لیا ہے۔

> میڈا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تڑ سے ایک چپت دی اور پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر تھی... آزاد کہو کیا کہا؟ خوجی۔ ایک بوسہ لیا اور طرارہ بھرا تو کمرے سے باہر تھی۔ (۹)

عورت پر ریجھنا، بے عزتی پر جھوٹے بہانے بنانا، عورت کے جذبات سے کھیلنا، اسے پاؤں کی جوتی سمجھنا، اندھیرے اجالے کے تعلقات قائم کرنا اصل میں لکھنؤ کی پستی، کمینگی، ذلت اور گمراہی کی نشانیاں ہیں اخلاقی انحطاط دہلی کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ دولت کی فراوانی اور عیش ونشاط نے عورت کو نہ صرف امراء بلکہ عوام کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور اخلاقی قدریں اتنی پست ہوچکی تھیں کہ نوابوں کا گھر کی مہریوں پر ریجھنا اور عشق لڑانا عام تھا اس لیے وہ اپنے معیار سے گرتے، انسانیت سے گرتے اور گھر کی کسی مہری کی گود میں سر رکھ کر تسکین پاتے۔ مہریاں بھی نوابوں کے چونچلوں سے خوب واقف ہوتیں اور اپنے پھندوں میں پھنسا کر خوب لوٹتیں "عباسی مہری" کا کردار ایسی شاطر، چالاک، مکار اور عیار مہریوں کا عکاس ہے لکھنؤ کے پورے ماحول پر جنسی ثقافت چھائی تھی اور یہ جنسی ثقافت (Erotic culture) لکھنؤ کی پہچان بن گئی۔ طوائفوں کی گرم بازاری تھی بادشاہ، امراء اور معزز لوگ طوائفوں سے تعلقات رکھنے کو تہذیب گردانتے تھے وہ عیاشی، بدمعاشی اور زنا کاری کرتے رنڈی بازی ان کی طبیعت ثانی ہوتی۔ خوجی کا عورتوں کے چکر میں پھنسنا، ان پر عاشق ہونا اور ذلیل وخوار ہونا ان نوابوں کا پردہ فاش کرتا ہے جو عورت کے لیے ذلیل وخوار ہوئے اور ان لوگوں کے ذہنی رویوں کا بھی عکاس ہے جو عورت کو تہذیب گردانتے تھے۔ سرشار نے خوجی کے ذریعے جنسیت کو واضح کیا اور Erotomania جنون شہوت میں مبتلا معاشرہ کی سچی تصویر پیش کی۔ بقول مصباح الحق قیصر:

> سرشار کی تصویروں میں لکھنؤ ہر انداز اور ہر پہلو سے جلوگر ہے جس میں ہر رنگ اور ہر قسم کی تصویریں ملتی ہیں... لکھنؤ کے آخری تمدن اور سوسائٹی کی مکمل تصویریں سرشار نے پوری جزئیات کے ساتھ پیش کی ہیں۔ (۱۰)

سرشار اپنے دور کا سب سے اچھا ترجمان، مرقع نگار اور صحافی تھا اس نے اپنے تحریروں میں نوابوں کی حالت، مصاحبوں کی خوشامدیں، مغلانیوں اور مہریوں کی چالاکیاں، ضعیف الاعتقادی، شادی بیاہ، کے ہنگامے، چہلم کی رسمیں، طوائفوں کے ناز وانداز اور چور اچکوں، اٹھائی گیروں اور دغاباز لوگوں کا ذکر جگہ جگہ کیا ہے۔ خوجی کا کردار پورے ناول میں ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور لکھنؤی معاشرت کو سامنے لاتا ہے سرشار کی نظر سے معاشرت کا کوئی پہلو نہیں بچتا اور خوجی کا ہر کام، ہر عمل لکھنؤی زندگی کا عکاس ہے خوجی کا افیم کا شوقین ہونا معاشرے کے افراد میں چانڈو، افیم، تاڑی، گانجا، بھنگ، ٹھرے اور شراب کے نشوں کی ترجمانی کرتا ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ خوجی کو جہاز ڈوبنے کا اتنا غم نہیں جتنا افیم کھوجانے کا ہے۔ "افیم ہائے افیم چنیا بیگم کے ڈوبنے کا البتہ کمال رنج ہے"۔ خوجی نشے میں دھت رہتا ہے، دون کی لیتا ہے، ہوا میں تلوار چلاتا ہے وہ

نشے میں مدہوش رہنا چاہتا ہے تا کہ تابندہ اور چمکدار ماضی اس کو تکلف نہ دے نشے میں رہ کر تمام گزشتہ کمزوریوں پر پردہ ڈالنا اور انبساط کا حصول ہی اس کی زندگی کا حصول ہے۔ خوجی نشے میں رہ کر پرانی خواہشوں کی تکمیل چاہتا ہے مگر وہ طاقت وہ خواہشوں کی تکمیل اب صرف خواب میں پوری ہوسکتی ہے تابناک ماضی جو قصہ پارینہ ہو چکا ہے اب اس کو یاد کر کے آنسو بہانے کی بجائے وہ افیم کے نشے میں چور ہو کر اسے بھلاتا ہے۔ خوجی کا بار بار مارکھانا اور مارکھا کر شرمندہ ہونے کی بجائے ڈینگیں مارنا دلچسپ ہے جب کوئی طاقتور خوجی کے انجر پنجر ڈھیلے کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ماحول کو نظر لگ گئی ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی مکمل طور پر قابض ہونے جارہی ہے بادشاہوں کا جو حل کیا گیا وہ اتنے بے بس اور لاچار تھے کہ اپنے ہی ملک میں ان کی حالت کسی بھکاری سے کم نہ تھی وہ انگریزوں سے مقابلے کی سکت نہ رکھتے تھے وہ خوجی کی طرح بار بار پیٹتے اٹھتے اور پھر شرمندہ ہونے کی بجائے کوئی نیا معاہدہ کر لیتے وہ بیرونی مدد کے طلب گار تھے۔ خوجی کا بار بار یہ کہنا کہ نہ ہوئی قرولی ورنہ لاش پھڑک رہی ہوتی، اتنی قرولیاں بھونکتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا، خون کے شرائے بہہ جاتے مگر افسوس قرولی کبھی نہ ملنی تھی اور نہ ملی، ایسے حالات احساس کمتری کا احساس دلاتے ہیں کہ کسی چیز کی کمی ہے اصل میں کمی معاشرہ کے اپنے اندر ہوتی ہے خود پر اعتماد ختم ہو چکا ہوتا ہے اپنے اندر کوئی طاقت محسوس نہیں ہوتی اس لیے ہر کوئی بیرونی مدد کا طالب ہوتا ہے بار بار "نہ ہوئی قرولی"، "نہ ہوئی قرولی" پکار کر وہ خارجی مدد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تلوار کا استعمال کرنے کے لیے طاقت، ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہاں نوابوں کا یہ حال تھا کہ ذرا سا کوئی شور سنتے تو زنان خانوں میں جا چھپتے کیوں کہ معاشرہ بے عمل اور بے چینی کا شکار ہو چکا تھا محض معمولی سی تکلیف بھی ان کو پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ خوجی کا بار بار ٹٹو سے گرنا بھی معاشرے کی ابتر حالت کو بیان کرتا ہے۔ لوگوں کی دقیانوست، جہالت اور علمی معیار کا اندازہ لگائیں کہ پیروں فقیروں پر یقین، تعویز، ٹونے، ٹوٹکے، جادو، دم، درود، کے چکر میں پڑ کر حقیقت سے آنکھیں چرا لیتے تھے وہ بچوں کا علاج بھی پھونک، دم تعویز اور گنڈوں سے کروانا چاہتے کوئی لڑکے کے بیمار ہونے پر دم کروا رہا ہے اور کسی درویش سے پھونک مروا رہا ہے کوئی اس لیے درویش کے پاس جاتا ہے کہ ان کی پھونک سے لڑکے کی پیدائش ہوگی کسی کے نزدیک درویش کی پھونک ہی شادی کروائے گی کوئی نوکری لینے کے لیے درباروں پر چاندی دے رہا ہے اس طرح کے ڈھکوسلوں نے عوام کو دقیانوسیت کی طرف دھکیل دیا تھا۔ ''فسانۂ آزاد'' میں "قدوسی شاہ" کا کردار ایسے جعلی درویشوں اور نقلی پیروں کی نمائندگی کرتا ہے جو سادہ لوح عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں۔ عوام میں دقیانوسیت اور امراء میں نت نئے فیشن پروان چڑھ رہے تھے نئے فیشن فرصت کے لمحوں اور عیاشی کی طرف اشارہ ہیں یہاں تک کہ مرد بھی زنانہ کپڑے پہنتے بادشاہ نصیر الدین حیدر کی حالت ملاحظہ ہو:

> نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہوگئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے... یہاں تک کہ ولادت آئمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کر زچہ خانے میں بیٹھتے، چہرے اور حرکات سے

وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے۔ اس کے لیے ولادت، چھٹی اور نہانے کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو ان سے فرصت نہ ملتی، سلطنت کی طرف توجہ کون کرتا۔(۱۱)

بادشاہوں، امراء، وزرا کی حالت جب اس حد تک گری ہوئی ہو تو وہ کیا کارنامہ سرانجام دیں گے؟ وہ کچھ کیے بغیر ہی خود کو تیس مار خاں سمجھنے لگتے خوجی کا لاشوں پر تلوار بازی کرنا بزدلی کی طرف اشارہ ہے لیکن مکاری، عیاری، دکھاوا اور بناوٹ میں کیوں کہ لکھنؤ کے باشندوں کا کوئی ثانی نہیں اس لیے وہ بزدلی میں بھی خود کو بہادر کہلوانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں خوجی کا آزاد کو بغیر لڑائی کے ہی واپس چلنے کو کہنا لکھنؤی باشندوں کی حالت زار کا ثبوت ہے۔

خوجی۔ بھائی سنتے ہو۔ میاں آزاد۔ یار واپس چلو۔ اجی شرط تو یہی ہے نہ کہ تمغے لٹکا کر آؤ پھر یہ خبریں تمغے لٹکانے کی کہاں ہیں۔ ہے کہ نہیں آپ واپس چلیے۔ اور تمغہ میں ایک بنوادوں گا۔(۱۲)

خوجی آزاد کو یہ مشورہ اس لیے دیتے ہیں کہ خوجی چاہتا ہے کہ آزاد بغیر جنگ میں شرکت کیے نقلی تمغہ لے جائے اور حسن آرا کی شرط پوری ہو جائے اور شادی ہو جائے۔ رتن ناتھ سرشار نے خوجی سے ملتا جلتا ایک مزاحیہ کردار ناول "سیر کہسار" میں "مہراج بلی" کے نام سے تخلیق کیا ہے جو ایک بے وقوف گھامڑ اور کنجوسوں کا استاد ہے زبان دان بن کر فارسی کی ٹانگ توڑتا ہے یہ کردار نوابوں کی حالت کا سچا آئینہ دار بن کر سامنے آتا ہے۔ ان مزاحیہ کرداروں اور خاص طور "خوجی" میں داستان امیر حمزہ کے مزاحیہ کردار "عمرو عیار" کی جھلک موجود ہے۔ یہ چارلس ڈکنس کے "پک وک پیپر" کا چربہ بھی ہے اور اس میں ہسپانوی مصنف میگال ڈی سروینٹس (Miguel de Cervantes) کے ''ڈان کیخوٹے'' (Don Quixote) کی اوٹ پٹانگ حرکتیں اور حماقتیں بھی ہیں، ڈپٹی نذیر احمد کے مزاحیہ کردار "ظاہر دار بیگ" جیسی تصنع، بناوٹ ظاہری چمک دمک اور چرب زبانی بھی ہے اگر کہا جائے کہ "خوجی" میں سرشار نے کئی مزاحیہ کرداروں کی عادات اور خصوصیات کو اکٹھا کر دیا ہے تو برمحل ہوگا۔ اس کردار کی خوبی اور انفرادیت یہ ہے کہ مکمل مزاحیہ کردار ہے اور سرشار نے اس کے ذریعے لکھنؤ تہذیب کا مکمل مرقع کھینچ دیا ہے یہ کردار لکھنؤی تمدن کی تخلیق، انحطاط زوال کا اثر اور انسان کی فطری کمزوریوں کا اشاریہ ہے۔ خوجی ایک کردار، ایک خاکہ، ایک جیتا جاگتا لکھنؤ ہے اس کے ذریعے لکھنؤی معاشرت، لوگوں کے رویے، طرز زیست اور تہذیب وثقافت کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

منشی سجاد حسین لکھنؤی: نامور ادیب، دیدہ ور صحافی، ناول نگار، اور مزاح نگار تھے وہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور طرز ظرافت کے موجد تھے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی عربی اور فارسی میں دسترس رکھتے تھے رئیسوں کے خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے اچھی اور معیاری زندگی گزاری لکھنؤی زندگی کے عکاس ہیں ان کا بڑا کارنامہ ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء کو

ظریف اخبار "اودھ پنچ" کا اجراء ہے اس اخبار نے صحافت کی دنیا کو ایک نیا موڑ دیا چھتیس برس تک ادب کی خدمت کر کے ۱۹۱۲ء میں بند ہوا۔ اردو صحافت سجاد حسین کا اوڑھنا بچھونا تھا اودھ ریاست پر دہلی کے زوال کی پرچھائیاں پڑ چکی تھی تاہم لکھنؤ میں امن کی صورتحال اور آرام دہ زندگی لوگوں کو اپنی طرف لبھا رہی تھی۔ ''اودھ پنچ'' سے پہلے لکھنؤ کا پہلا اخبار ۱۸۴۷ء میں "لکھنؤ اخبار" کے نام سے جاری ہوا، ۱۸۵۶ء میں "طلسم لکھنؤ"، ۱۸۵۹ء میں منشی نول کشور کا" اودھ اخبار"، ۱۸۷۰ء میں ''تہذیب الاخلاق'' بھی منظر عام پر آ چکے تھے۔ ''اودھ پنچ'' اردو کا پہلا ظریف اخبار ہونے کی وجہ سے سب میں منفرد تھا طاہر مسعود لکھتے ہیں کہ:

> ۱۶ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لکھنؤ سے منشی سجاد حسین نے ایک ایسے اخبار کا اجراء کیا جس نے برصغیر کی صحافت میں ہلچل مچا دی۔ (۱۳)

منشی سجاد حسین کا مزاج لڑکپن سے ہی ظریفانہ تھا طبیعت میں ٹھٹھول اور شوخی تھی اس لیے جب موصوف نے ہاتھ میں قلم لیا اور میدان صحافت میں قدم رکھا تو اپنا رنگ جمایا۔ معاشرتی اقدار و مسائل مزاح کی کسوٹی پر پرکھے اور اپنے عہد کے سیاسی اور ملی مسائل کو پہلی بار طنز و مزاح کا نشانہ اور افراد کے طرز زیست اور رویوں کو مزاح کا ہدف بنایا۔ اودھ پنچ کی حیثیت صرف اخبار کی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ادارہ تھا اور سجاد حسین اس ادارے کی روح تھے اس لیے آپ کو انیسویں صدی کے جدید مزاح کا بانی بھی کہا جاتا ہے انھوں نے مختلف کرداروں کے ذریعے لکھنوی ہندوستانی باشندوں کے مسائل حل کرنے میں تن من دھن کی بازی لگا دی "چکبست" کہتے ہیں "سجاد حسین کا طرز تحریر سب سے الگ ہے مضمون کیا ہیں چھوٹے چھوٹے چٹکلوں اور لطیفوں کے ذخیرے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا مصنف سے گفتگو کر رہا ہے"۔ منشی سجاد حسین لکھنؤ کی زبان اور اپنے رنگ کے استاد تھے انھوں نے ایسی قوم کی اصلاح کی جس پر مغرب کا جادو چل چکا تھا اور وہ انگریزی زبان کو علم و فضل کا معیار سمجھنے لگے تھے، انگریزوں جیسا لباس پہننا باعث عزت تھا اس لیے وہ انگریزی عہدوں کے حصول کی تگ و دو میں لگ گئے اور اپنے عقائد اور رسوم سے ہٹنے لگے انگریزی تہذیب و ثقافت کو اپنانے لگے ایسے میں منشی سجاد حسین نے معاشرہ کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں نے ہر شعبہ میں طبع آزمائی کی سیاست، تہذیب، معاشرتی اقدار، لوگوں کی کج رویوں کو طنز و مزاح کے ذریعے تنقید کا نشانہ بنایا سجاد حسین نے صحافت کو مشن بنا دیا تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ آپ کانگرس کے حامی اور کسی حد تک روایت پسند تھے سرسید کی مخالفت کر کے انھیں "پیر نیچر" بھی کہا لیکن آپ کا ذہن آنے والی تبدیلیوں کا بھی احاطہ کر چکا تھا۔ ''اودھ پنچ'' کا دور مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ کا دور تھا مشرقی تہذیب کا زوال ہو رہا تھا وہ اپنی شناخت کھو رہی تھی اور سجاد حسین مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اس لیے ان کی تحریروں میں مغربی تہذیب سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے آپ بے ارنویس مصنّفین میں سے تھے اور لکھنوی تہذیب کے پروردہ تھے اودھ پنچ میں اداریے، رنگا رنگ مضامین اور دیگر مزاحیہ تحریروں کے ذریعے اس دور کی کھوکھلی معاشرت کو طنز کا نشانہ بنایا شگفتہ انداز اختیار کر کے بے بس معاشرے کی سچی

تصویریں پیش کرنا آپ کا کارنامہ ہے۔لکھنؤ میں دولت کی فروانی اور عیش وعشرت کا معقول انتظام تھا لوگوں کی اخلاقی قدریں گر چکی تھی سجاد حسین نے معاشرے کو روحانی، مذہبی قدروں کی یاد دلائی اور سوئی ہوئی ہندوستانی معاشرت کو ہوش میں لانے اور جگانے کی کوشش کی انھوں نے لکھنؤ کے نشست و برخاست کے طریقے، رہن سہن، میلے ٹھیلوں کا حال لوگوں کی طرز زیست اور تہذیب وثقافت کو مزاحیہ کرداروں کے ذریعے پیش کیا وہ لکھنوی تہذیب کے چشم دیدہ گواہ تھے،فطری ظرافت، شگفتگی، انبساط، چٹکلے، چھوٹے چھوٹے دل موہ لینے والے جملے، مزاحیہ کیفیت جو کچھ انھوں نے بیان کیا وہ لکھنؤ کے ماحول کا تقاضا تھا اس لیے جہاں کہیں ہمیں ''اودھ پنچ'' اور سجاد حسین کی تحریروں میں پھکڑ پن فحاشی یا عریانی نظر آتی ہے وہ اس تہذیب کی ڈیمانڈ تھی ان کے قلم سے نکلنے والے زندہ جاوید کردار ماحول کے ترجمان اور آئینہ دار ہیں۔ ان کے تخلیق کیے گئے کردار مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں ان کا ناول "طرح دار لونڈی" میں ہر کردار معاشرت کا ترجمان ہے مثلاً نواب کا کردار "فسانۂ آزاد" کے نواب کے کردار کی یاد تازہ کرتا ہے وہی محفلیں وہی عیاشی اور بزدلی کہ ذرا ذرا سی بات پر زنان خانے کی طرف دوڑنا مٹی کے مادھو بنے یہ نواب صاحب سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھ بنتے ہیں بلڈ پریشر کے مریض ہیں اِن کا علاج مصاحبوں کے پاس ہے۔ جو چکنی چپڑی باتوں سے اِن کے دِل کو بہلاتے ہیں وہ مصاحب "شیخ جی" اور "مرزا جی" کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں،اپنے گنوں میں پورے ہیں اور خوشامدیں کر کے اپنا مطلب نکالتے ہیں اِن کی عادات، گفتگو اور عیاریاں وہی "فسانۂ آزاد" کے مصاحبوں جیسی ہیں۔"ننھے مرزا" کا کردار معاشرے میں چھپے مطلب پرستوں کی ترجمانی کرتا ہے یہ ظاہر داری میں بہت حد تک ڈپٹی نذیر احمد کے "ظاہر دار بیگ" کے مشابہ ہے اور چرب زبانی سے لونڈی کو پھانستا ہے۔سب سے دلچسپ اور منفرد کردار طرح دار لونڈی یعنی نجبنیا کا ہے شروع میں بالکل معصوم، بھولی بھالی اور ناول کے آخر تک بڑے بڑوں کے کان کترتے نظر آتی ہے وہ گھر کی بھیدی ہے اور دوسرے نوکروں کے ساتھ مل کر لنکا ڈھاتی ہے یوں تیرے میرے ٹکڑوں پر پلنے والی لونڈی بعد میں چلتر باز، تیز طرار، چالاک، مکار اور مطلب پرستی کے تمام گروں سے واقف ہو کر دوسروں کو کچو کے دیتی ہے۔اس کردار میں ڈپٹی نذیر احمد کی "ماما عظمت" کی جھلک ہے فرق اتنا ہے کہ "ماما عظمت" گھر کی نوکرانی ہے گھر کے سودا سلف سے پیسے بچانا اس کی خصلت ہے جبکہ طرح دار لونڈی اس سے لمبی اڑان بھرتی ہے وہ گھر کا صفایا بھی کرتی ہے اور عیش و عشرت حاصل کرنے کے لیے بخشو اور ننھے میاں کو تگنی کا ناچ بھی نچاتی ہے اپنے طبقے کی رزالت اور کمینگی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے وہ نجبنیا سے نجبین پھر نجم النساء اور آخر میں بسم اللہ خانم کے روپ اختیار کر کے زندگی کا مزہ لینا چاہتی ہے یہ اپنے طبقے کا ایک نمائندہ کردار ہے لکھنؤ میں نوابوں کی اپنی عیاشیاں تھی امراء، روسا اور معاشرہ کے معزز لوگ زندگی سے لطف کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے تھے ایسے میں نچلے طبقے میں اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ایسے روپ دھارنا عام بات تھی اس کردار کے ذریعے سجاد حسین نے لکھنؤ کے نچلے طبقے کی زندگیوں کے اغراض ومقاصد بھی بیان کیے ہیں۔انور جمال پاشا سجاد حسین کی تحریروں کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

مزاحیہ تحریریں اس عہد کے ہندوستانی معاشرے کی صورتحال کی ترجمان ہیں اس عہد کی تہذیبی کشمکش کی صورتحال جس دلچسپ انداز میں ان تحریروں میں ملتی ہے انھیں اس عہد کے عصری مرقع کا درجہ عطا کرتی ہے۔(۱۴)

احمق الدین نواب بھلن عرف بھولے نواب کا مزاحیہ کردار بھی حرکتوں اور مضحکہ خیز گفتگو اور حماقتوں کے وجہ سے انفرادیت رکھتا ہے سجاد حسین نے اس کردار کے ذریعے نوابوں کے حالات کی عکاسی کی ہے گانے کی محفلیں کرنا، دوستوں کے جمگھٹے لگانا، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر زندگی کے مزے لینے میں مگن نواب بھلن غفلت اور لا پروائی میں ساری حدیں پار کر گئے تھے عقل کے اندھے گانٹھ کے پورے ہمارے بھولے نواب باپ کے ورثہ میں ملی دولت کو عیاشی کے مشغلوں میں لگاتے ہیں خوشی اور انبساط کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزارنے کو تیار بھولے نواب لکھنوی معاشرت کے نمائندہ نواب ہیں لکھنؤ کے نوابوں کی بزدلی، سہیل پسندی اور تن آسانی کو اس کردار کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے بزدلی کا یہ عالم ہے کہ پولیس کو دیکھ کر نواب بھلن ٹرین کی سیٹوں کے نیچے جا چھپتے ہیں۔ نوابوں کو بے وقوف بنانا مصاحبوں اور لونڈیوں کا بایاں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گھر کی مامائیں، مہریاں اور نچلے طبقے کی لونڈیوں نوابوں کو من گھڑت قصے سنا کر رام کرتیں اور منٹوں میں لائن پر لا کر اپنا مطلب نکالتیں ناول احمق الذین میں "امیر بی بی" کا کردار ایسی ہی شاطرہ کا ہے جو نواب بھلن کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر پیسے ہتھیاتی ہے نوابوں کی جسمانی، ذہنی اور دیگر کمزوریوں کا بھی رونا رویا گیا ہے ظاہر ہے نازنخرے اور چونچلوں میں پلے نواب جب حقیقی زندگی میں قدم رکھتے تو ان کی چیخیں نکل جاتیں جب نواب بھلن کو کچھ پیدل چلنا پڑا تو اس کی حالت ملاحظہ ہو:

نواب کی چولیں ڈھیلی ہوگئیں ایک ایک پاؤں من من کا ہوگیا، پنڈلیوں میں جان تک نہ رہی، سانس پھولنے لگی۔(۱۵)

رئیس اور نوابوں کے پاس فرصت زیادہ اور کام کم تھا، دولت وافر، سامان عیش بے انداز، دل خوش، طبیعت بشاش ہوتی تھی پھر اگر پیدل چلنا پڑ جائے تو ان کی چولیں ڈھیلی ہونا اور سانس پھولنا اچنبھے کی بات نہیں۔ اس کردار کے ذریعے جگہ جگہ لکھنوی معاشرت کے نمونے موجود ہیں مولویوں پر بھی طنز کیا گیا ہے ان کے چہروں سے نقاب اٹھائے گئے ہیں۔ بھلن نواب احمقوں کے احمق ہیں اس لیے اپنی حماقتوں سے جگہ جگہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں جلد بازی میں اپنے حواس کھو بیٹھنا، اپنی مونچھ کتر لینا، ان کی اضافی خوبیاں ہیں نواب کا ایک لیڈی کے عشق میں گرفتار ہو کر اس سے نکاح کرنا، گھر لانا، انگریزی تہذیب کو اپنانے کے چکر میں ذلیل و خوار ہونا نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ سجاد حسین نے اس کردار کے ذریعے انگریزوں کی تہذیب کے نقائص بھی دکھائے ہیں اور مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات، رویوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں "امیر بی بی"، "ماما خاتون"، حکیم کرامت اور میر صادق کے کردار اپنے اپنے طبقوں کے نمائندہ کردار ہیں لیڈی اسمتھ کا کردار انگریزی تہذیب کا آئینہ دار ہے اور نواب بھلن جسمانی لذت کے حصول کے لیے اپنا گھر بار، رشتے ناطے سب داؤ پر لگا

دیتے ہیں وہ لطف حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وقتی خوشی اور انبساط کے حصول کے لیے دائمی مفاد کو پس پست ڈال دیتے ہیں اور نتیجتاً پاگل خانے پہنچ جاتے ہیں اس کردار کے ذریعے لکھنوی معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے سچے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ سجاد حسین کا سب سے مشہور مزاحیہ کردار "حاجی بغلول" ہے جو شہسواری کا ماہر، مقدمہ بازی میں یدطولی، عشق بازی میں سب سے آگے، احمقوں کا سردار، گھامڑوں کا سرخیل، اپنے سوا سب کو بے وقوف سمجھنے والا، لکھنؤ اور اس کے بےفکروں کی جھلک پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:

> سرشار کے خوجی کی طرح حاجی بغلول بھی ایک مستقل کردار بن چکا ہے اور یہی حال ان کے احمق الذین کا ہے۔ (۱۶)

حاجی بغلول کا مضحکہ خیز اور عجیب وغریب حلیہ دراصل لکھنوی تہذیب کا مذاق اڑانے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔

حاجی بغلول کا ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چلنا لکھنوی معاشرے کی کمزوری کی طرف اشارہ ہے انگریزی عملداری کی وجہ سے معاشرہ اپنے پیروں پر نہیں کھڑا تھا حاجی بغلول کی طرح معاشرہ بھی لنگڑا ہو چکا تھا اسے سہارے کی ضرورت تھی اور سہارے کی تلاش اسے حقیقت سے دور لے جاتی اور وہ عارضی خوشی میں ہی غرق ہو کر رہ جاتا۔ حاجی بغلول کی جسمانی بناوٹ میں نقص ہیں۔ جیسے اس کا قد چھوٹا ہے اور توند بڑی، آنکھیں اندر کو گھسی ہوئی اور کان لمبے، ناک چپٹی اور نتھنے خوب چوڑے، رنگ سیاہ اور داڑھی سفید یعنی نقائص کا مجموعہ بنا کر حاجی بغلول کو پیش کیا گیا ہے اصل میں معاشرے کے افراد کی زندگیاں نقائص سے بھری ہوئی تھیں ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقوں کے لوگ انبساطی زندگی کا شکار ہو کر عجیب طریقے سے جی رہے تھے۔ حاجی بغلول کا عجیب وغریب لباس لکھنوی باشندوں کے ملبوسات کا منہ چڑا رہا ہے۔ چرب زبان حاجی بغلول دوسروں کو اُلّو بنانے کے چکر میں خود چغد بن جاتے ہیں خود کو نمایاں کرنے اور ظاہری شان وشوکت کے لیے جب کوئی جتن کرتے ہیں تو ذلیل وخوار ہوتے ہیں یہ عادات لکھنوی باشندوں کے مشاغل کی آئینہ دار ہیں۔ حاجی بغلول جہانیاں جہاں گشت قسم کا کردار ہے اور مختلف طبقات کے لوگوں سے ملتا ہے اس کے پاؤں میں آندھی روگ ہے یہ خود ساختہ مصائب میں گرفتار ہو کر اپنے حو اس کھو دیتا ہے جو کہ لکھنؤ کے باشندوں کے چلن اور بوکھلاہٹ کی نمائندگی ہے۔ یہ کردار مختلف لوگوں کی عادات واطوار اور طرز زیست کو اپنے تئیں بیان کرتا ہے۔ سجاد حسین نے ماحول کے ناقص پہلوؤں کو حاجی بغلول کے ذریعے پیش کر کے کمال مہارت سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ حاجی بغلول کو لکھنوی معاشرت کا نمائندہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سجاد حسین کے ناول حاجی بغلول کی بہت دھوم ہے... اس میں جگہ جگہ اس دور کے تہذیبی مظاہر کے بارے میں اشارے کیے گئے ہیں۔ لکھنؤ کا ماحول پیش ہوا ہے۔ (۱۷)

اس کردار کے ذریعے لکھنؤ کے میلے، چہلم کی رسمیں اور لوگوں کے رویے بھی بیان ہوئے ہیں اور لکھنوی معاشرہ کی خامیوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ حاجی بغلول میں سروانتے کے ناول ڈان کوئکزوٹ اور ڈکنس کے پک وک ابراڈ کے

واضح اثرات موجود ہیں۔ سرشار کا خوجی اور سجاد حسین کا حاجی بغلول ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ان میں مماثلت ہے خوجی "قرولی" کا استعمال کرتے ہیں اور حاجی بغلول "جریب زیتونی" کو استعمال میں لاتے ہیں۔ معاشرتی حالات، لوگوں کی ذہنی سطح، اخلاقی اقدار، دماغی پستی، سیاسی اور سماجی حالات کو اس کردار کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ حاجی بغلول کی بغلولیت تعیش اور تصنع میں پڑے معاشرے کے منہ پر تھپڑ کے مترادف ہے پلاٹ، تکنیک کے حوالے سے اس ناول میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن "حاجی بغلول" کا کردار اس کو چار چاند لگا کر اعلیٰ پایہ کا ناول بنا دیتا ہے مقامی تہذیب میں رچا بسا ہونے کی بدولت اور چھوٹے کینوس پر لکھنوی تہذیب کے خدوخال کو ابھارنے کی وجہ سے لکھنوی تہذیب کا آئینہ دار اور عکاس ہے۔ پروفیسر علی احمد کاظمی کی رائے ملاحظہ ہو:

> حاجی بغلول ہوں کہ بھولے نواب ان دونوں کرداروں نے بالخصوص اپنی اپنی مزاحیہ حرکتوں سے پورے سماجی شعور اور تہذیبی عرفان وادراک کا پتا دیتے ہیں۔ (۱۸)

لکھنؤ معاشرہ کا کھوکھلا پن، لوگوں کی ذہنی حالتیں، معاشرت، مٹی ہوئی تہذیب وثقافت کو سجاد حسین نے حاجی بغلول، احمق الذین اور چند دوسرے کرداروں کے ذریعے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ہم ان کرداروں کے ذریعے خود کو لکھنؤ میں گھومتا پھرتا محسوس کرتے ہیں یہ لکھنوی تہذیب کے سچے عکاس ہیں۔

مجموعی طور پر دونوں مزاح نگاروں (پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین) کا تقابلی جائزہ لیں تو عیاں ہوتا ہے کہ فن کار اپنے عہد کا اکتساب کرتا ہے دونوں مزاح نگاروں کے طبعی رنگ جدا تھے۔ ظاہر ہے ہر فن کار کے اپنے نظریات اور عقائد ہوتے ہیں جو دوسرے فن کار سے یقیناً کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں لیکن دونوں کے ہاں لکھنؤ کی تہذیب کے بکھرے ہوئے نقوش موجود ہیں اور لکھنؤ کے محاورات اور لب ولہجہ کو نثر کا جامہ پہنا کر معاشرے کی اصلاح، مصوری اور معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ دونوں لکھنؤ کے تہذیبی مزاج، معاشی اور سیاسی نفسیات اور لوگوں کے طرز زیست سے متاثر ہوئے اور مزاحیہ کرداروں کے ذریعے لوگوں کے اعمال، طور طریقے اور انسانی زندگی کے خدوخال پیش کرنے میں کامیاب ہوئے دونوں کا دور واجد علی شاہ کا دور ہے اس دور میں درباروں کا خاتمہ ہو رہا تھا، جاگیرداری نظام آخری سانسیں لے رہا تھا، ثقافتی اقدار اور تہذیبی روایات کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا انگریزوں کی آمد سے نئی ثقافتی زندگی کا آغاز ہوا اور مغربی ثقافت کے نقوش مشرقی ثقافت پر پڑنے لگے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ٹکرانے سے ایک نئی ہندوستانی تہذیب وجود میں آئی۔ سرشار اور سجاد حسین اسی زوال شدہ اور انحاط کا شکار لکھنوی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کسی بھی معاشرہ میں عام طور پر تین طبقے ہوتے ہیں اول اعلیٰ طبقہ جس میں بادشاہ، وزرا، امرا اور نواب قسم کے لوگ ہوتے ہیں دوم متوسطہ درجے کے لوگ، سوم نچلے طبقے کے افراد، دونوں مزاح نگاروں کے ہاں تینوں طبقے، کرداروں کی صورت میں موجود ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے شوق رنگ برنگی محفلیں، شراب، طوائف، افیون، بٹیر بازی، عیاشی، تعیش پسند زندگی ہے سجاد حسین نے اس طبقے کی نمائندگی "نواب بھلن" اور "نواب صاحب"

کے ذریعے کی ہے۔نواب بھلن ناول "احمق الذین" کا کردار ہے اور نواب صاحب ناول "طرح دار لونڈی" کا کردار ہے دونوں کرداروں کے ذریعے نوابوں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور معاشرے کے نوابوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ جبکہ سرشار نے "جام سرشار" ناول میں نواب امین الدین، نصرت الدولہ، سیٹھ گوجرمل، "سیر کہسار" میں نواب عسکری، نواب بشیر الدولہ، "کامنی" ناول میں سرن لالہ، ناول کڑھم دھم میں "ممتاز دوھا" جیسے کردار تخلیق کر کے لکھنوی نوابوں کو ہمارے سامنے لائے ہیں یہ نواب جن کی زندگی کا مقصد عیاشی، عورتوں سے عشق، جنسی تا پاک کا حصول، ہر دم ہر لمحہ بے فکری کی زندگی تھا اور وقتی مسرت کے حصول کے لیے اپنی عزت، دولت، شہرت سب کچھ قربان کر دیتے تھے یہ شراب، افیون، گانجا کے شوقین تو ہوتے ہی تھے عورت کے معاملے میں ان کی حالت ایسی تھی کہ ایک عورت کی ایڑی کے نیچے کئی نوابوں کی ناک ہوتی تھی درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر انھیں عادتوں کا شکار تھے۔ نچلے درجے کے لوگ ان فرصت اور انسباط سے بھرپور لمحوں کو حاصل کرنے لے لیے ہر طرح کے پاپڑ بیلنے کو تیار تھے نچلے طبقوں میں مصاحب، نوکر چاکر، بھنگن، کبڈن، مہران، مالن، کہارن وغیرہ شامل تھے۔ ان میں اکثر تو دوسرے ملازموں سے مل کر گھر کا صفایا کرتیں جیسے طرح دار لونڈی میں سجاد حسین کا کردار نجبنیا ہے۔ کچھ نوابوں پر ڈورے ڈال کر، عشق کے چکر میں پھنسا کر ان کی عاقبت اور دنیا کو نشان عبرت بناتیں سجاد حسین کا "امیر بی بی" کا کردار اور سرشار کا ظہورن، قمرن چوڑی والی، نازو، فرخندہ، للّی کے کردار، نوابوں کو عشق کے چکر میں پھنسا کر لوٹنے والیوں کے نمائندہ ہیں، عورت جنس کی طرح لکھنؤ کے معاشرے پر سوار تھی۔ اس لیے دونوں مزاح نگاروں کے ہاں طوائفوں، مغلانیوں، مہریوں، ماماؤں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ نوابوں پر ڈورے ڈالتی ہیں کیونکہ وہ اپنے عہد کے جنسی رویوں سے واقف تھیں اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتی۔ سجاد حسین کا "عباسی خانم" اور سرشار کا "عباسی لاڈو" کا کردار ایسی ذہنیت کی عورتوں کا ترجمان ہے۔ مصاحبوں میں سجاد حسین کے شیخ جی، مرزا جی، بخشو اور رتن ناتھ سرشار کے تراب علی، میر گلباز، روشن علی، گھسیٹے وغیرہ مصاحبوں کی زندگی کے ترجمان ہیں مزاحیہ کرداروں میں سجاد حسین کے بھولے نواب، حاجی بغلول اپنے طبقے کے نمائندہ ہیں سرشار کے خوجی، مہراج بلی، سلا رو، مسخر الدولہ، شاہ جی، قلندر، بہروپیا، ندرت، امامی، چڈا گلخیر اہمیت کے حامل ہیں۔ سرشار کا ایک کردار ھشو یعنی جونی پرشاد بھی مزاحیہ کردار ہے یہ مزاحیہ کردار لکھنوی عہد کے ترجمان ہیں سجاد حسین کے مقابلے میں رتن ناتھ سرشار کے کردار زیادہ ہیں۔ ان کے ناول کرداروں کے جنگل ہیں لیکن دونوں مزاح نگاروں نے فرشتہ بن کر لکھا اور شیطان بن کر سوچا ہے۔ واقعات، مکالمہ نگاری، منظر نگاری میں ان کے کرشمے اپنی جگہ لیکن کردار نگاری اور مزاحیہ کرداروں کی تخلیق میں ان کا معیار بہت بلند ہے دونوں نے لکھنوی عہد کو صفحہ قرطاس پر پھیلا دیا ہے اور دونوں ہی اس عہد کے آئینہ دار اور عکاس ہیں۔ دونوں مزاح نگاروں کے متعلق "احرار نقوی" کی رائے ہے کہ:

> منشی سجاد حسین اور پنڈت رتن ناتھ سرشار طنز و مزاح کے ذریعے جدید تقاضوں کو ابھار رہے تھے یہ دونوں تہذیب کے مرثیہ گو بھی تھے اور قصیدہ نویس ابھی مگر اقدار کی رجز

خوانی سے بھی بے خبر نہ تھے۔(۱۹)

زمانے کی تہذیب ومعاشرت، سماجی اور معاشرتی حالات، فرقوں اور مذہبوں کے عقائد، توہمات، ضعیف الاعتقادی، رسوم ورواج، مشاغل ومعمولات اور رہن سہن کو مختلف طریقوں سے مختلف فن کاروں نے پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد کے مضامین اپنے اندر علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی توانائیاں لیے ہوئے ہیں اور سماجی، ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا نے ناول "امراؤ جان ادا" کو لکھنؤ کی پوری تہذیب کی کہانی بنا کر پیش کر دیا اس میں انھوں نے طوائفیت، امیانہ حرکات وسکنات، لوگوں کی عادات واطوار، شرفا اور امرا کے مشاغل اور انبساطی محفلوں اور محلاتی رنگینوں کا ذکر کر کے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ اردو کے والٹر سکاٹ عبد الحلیم شرر نے تاریخی ناول اصلاحی مقصد اور جذبہ کے تحت لکھے ان میں فطری سنجیدگی، متانت، سادگی اور رنگینی مزاج کی امتزاجی شان کو مجروح نہیں ہونے دیتے، عہد رفتہ کی تہذیب اور معاشرتوں کا انھوں نے عمیق نظری سے جائزہ لیا ہندوستان کے مسلمانوں کی زبوں حالی، سیاسی وسماجی ابتری اور کسمپرسی کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے ناول مشرقی تہذیب کے مرقعے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے دہلوی زندگی کے نمونے پیش کیے ہیں دہلوی عہد کی معاشرتی زندگی کو بے تکلفی، بے ساختگی، روانی، شائستگی اور دلکشی کے ساتھ پیش کرنے میں انھوں نے ایک مزاحیہ کردار "مرزا ظاہر دار بیگ" سے بھی کام لیا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ جو "مرزا الم نشرح" کے نام سے لکھتے تھے۔ انھوں نے قدیم معاشرت اور تہذیب کو اپنے ذہن میں بسایا ہوا تھا اس لیے مشرق کے دلدادہ کہلاتے ہیں۔ اپنے مضامین میں وہ خوش طبعی اور خوش مذاقی کو بروے کار لاتے ہیں۔ ان کے مضامین میں کئی مزاحیہ کردار دہلوی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور فرحت اللہ بیگ نے دہلوی طرزِ معاشرت کو محفوظ کیا ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی سجاد حسین کے سامنے مٹتی ہوئی لکھنوی تہذیب کی پوری تصویر موجود تھی۔ انھوں نے مزاحیہ کرداروں کے ذریعے لکھنؤ کا ماحول، گلی کوچے، شاہان لکھنؤ کی فیاضیاں، لکھنؤ کا بانکپن، نسوانی زندگی کی جھلکیاں، عورتوں کی چھیڑ چھاڑ، مردوں کے مشاغل، عورتوں کے جو نچلے، تریا چلتر، بازاروں کے نظارے، معاشرے کی جملہ آلائشیں، شادی بیاہ کی رسوم، کھانا ولباس، بودوباش، آداب واخلاق، طرزِ زیست پوری تہذیب وثقافت اور دیگر سماجی اور معاشرتی حالات کو بیان کر کے زندہ جاوید کر دیا ہے دونوں مزاح نگار لکھنوی تہذیب کے نمائندے، آئینہ دار اور عکاس ہیں۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح، (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۷ء)، ص ۷۴

(۲) سیّد وقار عظیم، فن افسانہ نگاری، (دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ایم اے آفسٹ پرنٹرز، ۱۹۴۷ء)، ص ۱۲۲

(۳) رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جلد اول، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۰

(۴) عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنؤ (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ)، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، مقدمہ: ڈاکٹر سلیم اختر، ۲۰۰۶ء)، ص۹۱

(۵) اختر عبداللطیف، فسانۂ آزاد کے کردار (ایک تنقیدی جائزہ)، (ملتان: الدین پبلی کیشنز، سن ندارد)، ص۱۹۱

(۶) رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جلد اول، ۱۹۸۶ء)، ص ۴۲۲

(۷) ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء)، ص ۲۰۰

(۸) عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنؤ (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ)، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، مرتبہ: محمد اکرم چغتائی، ۲۰۰۶ء)، ص۶۸۔۷۰

(۹) رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جلد دوم، ۱۹۸۶ء)، ص۴۶۱۔ ۴۶۲

(۱۰) ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، (لکھنو: مکتبہ دین و ادب، ۱۹۷۸ء)، ص ۷

(۱۱) عبدالحلیم شرر، گزشتہ لکھنؤ (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ)، ص ۸۸

(۱۲) رتن ناتھ سرشار، فسانۂ آزاد، (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جلد اول، ۱۹۸۶ء)، ص ۶۶۵

(۱۳) ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، (کراچی: یونی ورسٹی آف کراچی، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۱۹۹۵ء)، ص ۶۵۶

(۱۴) ڈاکٹر رؤف پاریکھ، اردو نثر میں مزاحیہ نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶۔۷۹ء)، ص ۱۳۰، ۱۳۱

(۱۵) سجاد حسین، احمق الذین، (لکھنو: نول کشور پریس، ۱۹۲۰ء)، صفحہ ۸۳

(۱۶) ڈاکٹر رؤف پاریکھ، اردو نثر میں مزاحیہ نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶۔۷۹ء)، ص۹۱

(۱۷) ڈاکٹر عبدالباری، لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، (دہلی: ایجوکیشنل ہاوس، ۲۰۰۶ء)، ص۹۱۱

(۱۸) ڈاکٹر خالد محمود، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، (دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۲۳

(۱۹) عظیم الشان صدیقی، اردو ناول، آغاز و ارتقا (۱۸۵۷۔ ۱۹۱۴ء)، (لاہور: بھٹو پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۸۲۔ ۳۱۲

مآخذ

(۱) آغا، وزیر، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۷ء

(۲) ادیب، سید لطیف حسین، ڈاکٹر، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۱ء

(۳) پاریکھ، رؤف، ڈاکٹر، اردو نثر میں مزاحیہ نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۶ء

(۴) حسین، سجاد، احمق الذین، لکھنو: نول کشور پریس، ۱۹۲۰ء

(۵) سرشار، رتن ناتھ، فسانۂ آزاد، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، جلد اول، ۱۹۸۶ء

(۶) ــــــ، ــــــ، ــــــ، جلد دوم، ــــــ

(۷) شرر، عبدالحلیم، گزشتہ لکھنؤ (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

لاہور، مرتبہ: محمد اکرم چغتائی، ۲۰۰۶ء
(۸) صدیقی، عظیم الشان، اردو ناول، آغاز و ارتقا (۱۸۵۷ـ۱۹۱۴ء)، لاہور: بھٹو پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۹ء
(۹) عبدالباری، ڈاکٹر، لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر، دہلی: ایجوکیشنل ہاوس، ۲۰۰۶ء
(۱۰) عبداللطیف، اختر، فسانۂ آزاد کے کردار (ایک تنقیدی جائزہ)، ملتان: الدین پبلی کیشنز، سن ندارد
(۱۱) عظیم، وقار، سیّد، فن افسانہ نگاری، دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ایم۔اے آفسٹ پرنٹرز، ۱۹۴۷ء
(۱۲) قیصر، مصباح الحسن، ڈاکٹر، اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، لکھنو: مکتبہ دین و ادب، ۱۹۷۸ء
(۱۳) محمود، خالد، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۵ء
(۱۴) مسعود، طاہر، ڈاکٹر، اردو صحافت انیسویں صدی میں، کراچی: یونی ورسٹی آف کراچی، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۱۹۹۵ء